R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۵ - شمارہ ۷ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ فروری ۱۹۶۶ء

اداریہ

فلموں کی زبان

حال میں بھی چند ایسے حضرات سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا جنھوں نے ایک عمر فلمی دنیا میں صرف کی ہے اور فلموں کے لیے کہانیاں، گانے، مکالمے یا اسکرپٹ لکھنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ فلموں کی زبان زیادہ تر اردو ہوتی ہے، لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اردو کیوں ہوتی ہے اور کس وجہ سے سنسکرت آمیز ہندی فلموں میں مقبول نہیں ہو سکی۔ اگر اس بات کو سمجھ لیا جائے تو اردو دوستوں کو اپنی زبان کی بعض ایسی خوبیوں کا اندازہ ہوگا جن کا انھیں پوری طرح احساس نہیں ہے۔

فلموں میں اردو زبان کسی خلوص، محبت یا ادبی خدمت کے جذبے کی وجہ سے استعمال نہیں ہوتی، بلکہ اس کی وجہ اس کا چلن ہے۔ چونکہ فلم کو تجارتی نقطۂ نظر سے کامیاب ہونا چاہیے اس لیے فلم بنانے والے چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے دیکھ سکیں اور اس سے لطف اٹھا سکیں۔ پھر انھیں یہ بھی خیال رہتا ہے کہ فلموں میں جذبات نگاری، کردار نگاری، ڈرامائی مواقع حیرت، مسرت، غم، درد و کرب، اچانک موڑ، خاموش تبدیلی کے جو عناصر ہوتے ہیں، ان سب کے اظہار کے بھرپور مواقع ملیں۔ اردو میں یہ بھی صلاحیت ہے۔ جہاں تک گانوں کا سوال ہے، گیتوں کی زبان ہندی سے زیادہ متاثر رہی ہے مگر اب اس پر بھی اردو کا رنگ چڑھتا جا رہا ہے کیونکہ عشقیہ شاعری کے لیے اردو زبان کا ظرف خاصا وسیع ہے۔ بہر حال آزادی کے بعد اردو زبان کی طرف سے ریاستی حکومتوں نے کتنی ہی بے اعتنائی کی ہو، فلم نے اردو کو گلے سے لگایا ہے۔ ہندوستانی فلم ابھی تک مجموعی طور پر کاروباری زیادہ ہے، فنی کم۔ مگر فلم دراصل فن کا ایک وسیلہ ہے اور اس کے تعلیمی، ادبی، علمی، معلوماتی اور سماجی اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے جیسے جیسے فلم کا معیار بلند ہوتا جائے گا، اس کے اچھے پہلو بھی اور نمایاں ہوتے جائیں گے، مگر ان پہلوؤں کو دل نشین بنانے میں سب سے بڑا حصہ زبان کا ہوگا اور یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ فلم اردو کو ہی سینے سے لگائے رہے گی اور اس طرح اردو کو پھیلانے اور مقبول بنانے میں اس کا رول ہمیشہ بہت اہم رہے گا۔

اس لیے اردو دوستوں کو فلم کی زبان، اس کے چلن، اس کی لچک، اس کے تنوع کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ وہ زبان زیادہ سے زیادہ عام فہم ہوگی۔ اس میں عربی فارسی کے وہ سارے الفاظ ہوں گے جو ہماری زبان کے جزو بن گئے ہیں، مگر نہ تو ان الفاظ کو خواہ مخواہ استعمال کیا جائے گا، نہ ان سے پرہیز ہوگا۔ دوسرے اس میں صرف کتابی زبان اور اس کی صحت کے مقابلے میں بول چال اور عام استعمال کو ترجیح دینی پڑے گی۔ تیسرے اس میں دوسری زبانوں سے ضرورت کے مطابق الفاظ بے تکلف لینے پڑیں گے۔ چوتھے اس کے لیے اپنے ادبی سرمائے کو بھی کھنگالنا پڑے گا اور ان الفاظ کو جو پیشہ وروں نے استعمال کیے ہیں یا وقت کی خراد پر چڑھ کر خوبصورت اور سڈول ہو گئے ہیں، اور زیادہ استعمال میں لانا پڑے گا۔ دراصل

اس شمارے میں

اردو کی مقبولیت کو بڑھانے کے لیے اپنی زبان سے زیادہ واقفیت اور اس کے چلن کے اصولوں سے اور زیادہ محبت پیدا کرنی پڑے گی زبان میں، سماج کی طرح تغیر بھی ہوتا ہے اور اس میں ایک تسلسل بھی ضروری ہے تسلسل اور تغیر میں توازن اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا ہے۔ اس نکتے کی اہمیت ہم دوسرے شعبوں میں بھی منوا سکتے ہیں تاکہ نہ تو انیسویں صدی کی ادبی اردو پر اصرار ہو اور نہ ایسی کھچڑی زبان استعمال ہونے لگے جس میں اردو کے اپنے مزاج کو نقصان پہنچ جائے۔

بہر حال فلم نے اردو کو پھیلانے میں جو شاندار کام کیا ہے اس کا اعتراف ہونا چاہیے اور اس کے لسانی نقطۂ نظر کو اور پھیلانا چاہیے۔ یہ ہم سب کے حق میں مفید ہوگا۔

ایک تصحیح

۸ فروری کے شمارے میں ساہتیہ اکاڈمی کے انعامات کے تذکرے میں ایک غلطی ہوگئی ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی کے انعامات ۱۹۵۵ء سے شروع ہوئے ہیں اس وقت سے اب تک نثر کی کتابوں پر چھ انعام اور نظم کی کتابوں پر چار انعام مل چکے ہیں۔ لیکن افسانوی ادب پر یہ پہلا انعام ہے۔ (ادارہ)

نو ہندوستانی زبانوں میں سویت کتابیں

ماسکو۔ پروگرس اشاعت گھر جو سوویت یونین کا ایک سب سے بڑا اشاعت گھر ہے عنقریب نو ہندوستانی زبانوں میں کتابیں شایع کرنے لگے گا۔ اس اشاعت گھر کے ہندوستان سے متعلق ایڈیٹوریل بورڈ کے صدر وکیتی نوسکوتوف نے اپنے ایک مضمون میں بتایا ہے کہ گذشتہ سال ہندی، اردو، بنگالی، تامل، مرہٹی اور تیلگو میں کتابیں شایع کی گئی تھیں۔ اس سال ملیالم، گجراتی، اور پنجابی میں بھی شایع کی جائیں گی۔ گذشتہ سال سوویت سائنس کے مختلف شعبوں سے متعلق کئی کتابیں شایع کی گئی تھیں۔ بنگالی میں ایک کتاب شایع کی گئی جو دل، دماغ کے سرجری، فالج کے علاج، مصنوعی گردوں کے استعمال وغیرہ کے سلسلے میں سوویت طب کی کامیابیوں کے بارے میں ممتاز سوویت سرجنوں کے مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ تمام مضامین عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کو سمجھ سکیں۔ نوسکوتوف نے بتایا کہ شولوخوف، چنگیز آئت ماتوف اور الکسی ٹالسٹائی کی بعض تصانیف کو دوبارہ شایع کیا جائے گا۔ روسی لوک کہانیوں، ممتاز سوویت شاعر الیس، مارشاک کی نظموں، نوسوف، سوٹئف، چیروشن اور دوسرے لوگوں کی کہانیوں کی صورت میں بچوں کو بعض اچھے تحفے حاصل ہو سکیں گے۔

وارن ہسٹنگز کا فارسی میں لکھا ہوا خط

کلکتہ ۱۴ فروری۔ برطانوی راج کے زمانے کے ہندوستان کے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز کا ایک فارسی خط ملا ہے۔ یہ خط مرشد آباد میں حاصل ہوا ہے جو مہاراجہ نند کمار کے نام ہے۔ اس خط کو ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت سے ریاستی آرکیولوجیکل گیلری میں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ خط ۵ اگست ۱۷۶۸ء کو لکھا گیا ہے۔ (دعوت، دہلی)

لال بہادر شاستری کی یاد میں سوویت لینڈ کا خصوصی شمارہ

نئی دہلی۔ سوویت سفارت گھر کے محکمۂ اطلاعات کی جانب سے مرحوم وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی یاد میں سوویت لینڈ (انگریزی) اور سوویت بھومی (ہندی) کا خصوصی شمارہ شایع کیا گیا ہے جس میں کئی تصویریں بھی شامل ہیں۔ سوویت سفیر برائے ہندوستان آئی۔ اے۔ بینا کتوف نے مسٹر شاستری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ہندوستان اور سوویت یونین کی دوستی کو مضبوط بنانے کے سلسلے میں مسٹر شاستری کی کوششوں پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ جواہر لال نہرو کی طرح مسٹر شاستری نے بھی دونوں ملکوں کی دوستی کی اہمیت کو محسوس کیا ہے ہندوستان اور سوویت یونین کے عوام کے درمیان مفاہمت کو ترقی دینے سے متعلق جواہر لال نہرو کی پالیسی کو آگے بڑھانے اور تاشقند کانفرنس کو کامیاب بنانے میں مسٹر شاستری نے جو حصہ لیا ہے اس پر دو ہندوستانی اخبار نویسوں نے اپنے مضامین میں روشنی ڈالی ہے۔ ان خصوصی شماروں میں مسٹر شاستری کی تقریروں کے ایسے اقتباس بھی شایع کیے گئے ہیں جن میں دوسری باتوں کے علاوہ ہندوستان اور سوویت یونین کے درمیان قریبی تعلقات پر زور دیا گیا ہے۔

کارل مارکس کے مسودوں کا نیلام

ماربرگ (مغربی جرمنی) چند دن قبل یہاں کمیونزم کے جنم داتا کارل مارکس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تین مسودات بڑی قیمت پر نیلام ہو گئے۔ ان مسودوں کی قیمت ۵۹ ہزار جرمن مارک ادا کی گئی ہے جو دس لاکھ روپے کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

کارل مارکس جرمنی کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے مسیحی مذہب قبول کر لیا تھا۔ (قومی آواز، لکھنؤ)

شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۹۶۶ء کا نظام اردو خطبات

نظام اردو خطبات کا آغاز اس سال ۲۵ اور ۲۶ فروری کو ہو رہا ہے۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند ان خطبات کا افتتاح اور جناب ڈاکٹر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ صاحب وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی ان جلسوں کی صدارت فرمائیں گے۔

ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین صاحب ۱۹۶۶ء کے مقرر منتخب ہوئے ہیں۔ ان کے خطبات کا موضوع "فکر انسانی کا ارتقا" ہے۔

سید فضل المتین

خواجہ قمرالدین راقم کی شرح دیوانِ غالب

ہماری زبان کی اشاعت ۸ر جنوری ۱۹۶۶ء میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کا ایک مراسلہ "خواجہ قمرالدین راقم کی شرح دیوانِ غالب" کے متعلق شائع ہوا ہے۔ احتشام صاحب نے اپنے مراسلے کے آغاز میں احوال غالب مرتبہ مختارالدین احمد (۱۹۵۳ء) کے حوالے سے راقم کے پوتے مرزا رفیق بیگ کے مختصر مضمون کا وہ حصہ نقل کیا ہے جو راقم کی شرح دیوان غالب سے تعلق رکھتا ہے اس کے بعد احتشام صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"اس اطلاع کے بعد میری نظر سے کبھی کوئی ایسا مضمون یا مراسلہ کہیں نہیں گزرا جس سے اس شرح دیوان غالب کے متعلق کوئی اور بات معلوم ہوتی۔ بالکل اتفاق ہے کہ چند دن پہلے ایک بزرگ نے یہ نسخہ ٹھیک اسی حالت میں جو خط کشیدہ الفاظ میں بیان کی گئی ہے، میرے حوالے کی ہے مجھے قطعی یقین ہے کہ یہ وہی اوراق ہیں، جن کا ذکر مرزا رفیق بیگ نے کیا ہے۔"

میں پروفیسر احتشام صاحب کی اطلاع کے لیے عرض کرتا ہوں کہ "راقم کی شرح دیوان غالب" کے عنوان سے ایک خاصہ تفصیلی اور تعارفی مضمون "اسلم فرخی" صاحب کا ہم قلم (ماہنامہ، کراچی (پاکستان) جلد ۲، شمارہ ۲۰ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون کی ابتدا میں اسلم فرخی صاحب لکھتے ہیں۔

"اکتوبر ۱۹۶۱ء کے ہم قلم" میں "راقم اور غالب" کے عنوان سے تحسین سروری صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ سروری صاحب نے مرزا رفیق بیگ نبیرۂ راقم کے حوالے سے لکھا ہے کہ۔"

اس کے بعد وہی عبارت درج ہے جو احتشام صاحب نے "احوال غالب" کے حوالے سے نقل کی ہے۔ فرق اس قدر ہے۔

احتشام صاحب کی جانب سے نقل کی گئی عبارت کی یہ تحریر (افسوس کہ انھوں نے بھی ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا) اسلم فرخی صاحب کی جانب سے نقل کی گئی عبارت میں نہیں ملتی اور احتشام صاحب کی جانب سے نقل کی گئی یہ تحریر "اس شرح کا سب سے پہلا مسودہ بہت کٹا پھٹا ہے" اسلم فرخی صاحب کی جانب سے نقل کی گئی تحریر میں اس طرح ہے "اس شرح کا سب سے پہلا مسودہ جو بہت کٹا پھٹا ہے"

اسلم فرخی صاحب کے مضمون کے اہم اور کارآمد اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

ا۔ سروری صاحب نے افسوس کیا ہے کہ غالبیات کے سلسلے کی ایک اچھی چیز ضائع ہو گئی۔

حسن اتفاق سے راقم الحروف کو اس شرح کا خوش خط مسودہ دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ مسودہ غالباً وہی ہوگا۔ جو راقم نے نواب ذوالقدر جنگ کے حوالے کیا تھا۔ مسودہ بڑے سائز کے دو سو چھبیس صفحات پر مشتمل ہے اس میں غزلیات غالب کی مکمل شرح اور ایک قصیدے "ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار" کے پانچ ابتدائی اشعار کی شرح ہے۔ ناقص الآخر ہونے کی وجہ سے یہ گمان گزرتا ہے کہ راقم نے قصائد کی بھی مکمل شرح لکھی ہوگی۔ لیکن آخر کے اوراق ضائع ہونے کی وجہ سے قصائد کی شرح ادھوری رہ گئی۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ مسودہ راقم ہی کی تحریر میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل متن میں بعض بعض جگہ تبدیلیاں کی گئی ہیں اور بعض جگہ حواشی کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ کانٹ چھانٹ مسودے کی تحریر کے مطابق ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ راقم نے مسودہ صاف کرنے کے بعد اس میں کچھ اضافے بھی کرنا ضروری سمجھا ہوگا۔ مسودہ کا یہ نسخہ حیدرآباد سے کراچی کس طرح پہنچا۔ اس کے بارے میں سید اشرف صاحب کو بھی جو اس کے مالک ہیں؟ کوئی علم نہیں کیونکہ انھیں یہ وراثت میں ملا ہے۔"

۲۔ "راقم، غالب کے عزیز اور ان سے استفادہ کرنے والوں میں تھے۔ غالب کے شارحین میں یہ فخر راقم اور حالی کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔ حالی نے غالب کے بعض بعض اشعار کی شرح کی ہے۔ اس وجہ سے "شرح راقم" کو اور زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔"

۳۔ "... ایک[عہ] اطلاع کے علاوہ راقم کی شرح میں کوئی اور خصوصیت ایسی نہیں، جس کی وجہ سے اس کا شمار غالبیات کے سلسلہ کی اچھی چیزوں میں کیا جائے۔"

عہ یہ ایک اطلاع غالبؔ کے شعر "دی مرے بھائی کو حق نے ازسرِ نو زندگی ۔ میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے" سے متعلق ہے۔ راقم نے اس شعر کی تشریح میں غالبؔ کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کے ایک عورت سے عشق، عشق کی وجہ سے دیوانگی، جنون کی زیادتی اور انتقال کا ذکر کیا ہے۔ اسلم فرخی صاحب نے اپنے مضمون میں اس شعر کی تشریح کے جواز میں خاصی بحث کی ہے۔

(رشید ۔ م)

۴۔ "راقم نے بعض معمولی اشعار کی تشریح میں ایسی دور از کار باتیں بیان کی ہیں جن کا غالب کے اشعار سے کوئی تعلق نہیں۔"

۵۔ "راقم معمولی دل و دماغ کے انسان تھے۔ غالب کی پرواز تخیل کا ساتھ دینا ان کے بس کی بات نہیں تھی لیکن اس سے راقم کی کوئی سبکی نہیں ہوئی۔ سبکی کی اصل وجہ تو ان کی وہ جولانی طبع ہے۔ جس نے ان کی شرح کو سنجیدگی کے دائرے سے علحدہ کرکے ہنسنے ہنسانے کی چیز بنا دیا ہے۔ راقم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ غالب کے مرکزی خیال کو پس پشت ڈال کر موشگافی کی دھن میں آگے بڑھ جاتے ہیں اور اصل سے کچھ مطلب نہیں رکھتے۔"

۶۔ "گھر کے بھیدی کا لنکا ڈھانا مشہور ہے۔ راقم بھی غالب کے عزیز اور گھر والے ہی تھے۔ غالب کی افتاد طبع اور ان کی زندگی کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے بعض اشعار کی تشریح میں اپنی اس واقفیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور گھر کے بھیدی بن کر لنکا ڈھانے کی کوشش کی ہے۔"

۷۔ "راقم کو وصل کے مضامین سے خاصی دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس دلچسپی کا ثبوت غالب کے اشعار کی تشریح میں بھی ملتا ہے۔"

اسلم فرخی صاحب کے مضمون کی اختتامی عبارت یہ ہے۔

"یہ چند مثالیں کسی تخمین کے بغیر پیش کی گئی ہیں۔ راقم کی شرح اسی قسم کے تسامحات، لطائف و ظرائف اور دور از کار خیالات سے پر ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس شرح کا شائع ہونا ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ اس کی اشاعت سے سلسلہ غالبیات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ راقم کے علم کا بھرم ضرور کھل جاتا اور ان کے لیے سامان رسوائی فراہم ہو جاتا۔ ممکن ہے کہ عالم بالا میں غالب نے اپنے اکثر شارحین کو معاف کر دیا ہو۔ لیکن یقین واثق ہے کہ انھوں نے راقم کو معاف نہیں کیا ہوگا۔ وہ یہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ان کے خانوادے کا ایک شخص جسے ان سے تلمذ بھی حاصل ہے ان کے اشعار کا خون کرے اور وہ خاموش رہیں۔ راقم معمولی دل و دماغ اور معمولی علم کے آدمی تھے غالب کے اشعار کو سمجھنا اور ان کی تشریح کرنا ان کے منصب سے بہت بلند تھا۔ انھوں نے خورشید پر بڑھ کر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ایسی کوشش میں بعض اوقات ہاتھ جل بھی جایا کرتا ہے۔ راقم کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن ان کی شرح کی عدم اشاعت نے انھیں رسوا ہونے سے بچا لیا۔"

احتشام صاحب کا یہ فرمانا۔

"مجھے قطعی یقین ہے کہ یہ وہی اوراق ہیں جن کا ذکر مرزا رفیق بیگ نے کیا ہے"

خدا جانے کن وجوہات پر مبنی ہے۔ پروفیسر صاحب سے گذارش ہے کہ وہ "قطعی یقین" پر اظہار اعتماد" کے لیے اہم معلومات سے آگاہ فرمائیں۔

کیا اچھا ہو کہ ہند و پاک میں پھر سے سلسلہ مراسلت قائم ہو جانے کے بعد احتشام صاحب اور سعید اشرف صاحب کے پاس موجود مسودات کا باہم موازنہ کیا جائے اور اس طرح پر کوئی صحیح رائے قائم کی جا سکے۔ سعید اشرف صاحب سے میرے مراسم ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ انھیں خط لکھ کر ان کے پاس موجود مسودہ سے متعلق دیگر اہم معلومات فراہم کروں۔ فی الحال اگر احتشام صاحب فرمائیں تو میں انھیں اسلم فرخی صاحب کے مضمون کی کٹنگ بھیج دیتا ہوں۔

صبحِ امن

سلام مچھلی شہری

بہارِ امن کی دیوی کی آمد آمد ہے
خوشی کا پرچمِ زرّیں فضا میں لہرا دو
سہانی شمعوں شگفتہ زریں نگاہوں سے
خیال و فکر کے سب معبدوں کو مہکا دو

ہمیں نے ظلمتِ دوراں پہ فتح پائی ہے
نئی سحر کے پیمبر بھی اب ہمیں ٹھہرے
جبینِ چرخ جھکے گی زمیں کے قدموں پر
ہمارے پھول ستاروں سے بھی حسیں ٹھہرے

مزا جب آئے کہ دورِ شبابِ گیتی میں
تصوراتِ بہاراں بھی کچھ بدل جائیں
جو جھانکتے ہیں زر و سیم کے مناروں سے
وہ کردگار و یزداں بھی کچھ بدل جائیں

یہ صبحِ تازہ مبارک ہو امن والوں کو
بہت سنبھال کے رکھنا ہے ان اجالوں کو

محمد قلی قطب شاہ

سعادت نظیر

گزرنے والے گزر جاتے ہیں جہاں سے مگر　　وہاں پہ چھوڑتے ہیں مستقل نقوشِ ہنر
ہر ایک شعبے میں رہتا ہے زندگی کا اثر
تصوراتِ کہن کو کبھی مٹا نہ سکیں　　انھیں بھلانا بھی چاہیں تو ہم بھلا نہ سکیں
ہمارے دعوے کی ہے یہ دلیل تاریخی　　نشانِ راہ ہے فہرستِ کارناموں کی
دکن کی خاک میں ہے روحِ قطب شاہ رچی
دکن میں ایسے نقوش اب بھی پائے جاتے ہیں　　زبانِ حال سے جو تیرے گیت گاتے ہیں
سلام تجھ پہ ہو اے شاعرِ بلند مقام　　ترا کلام ہے روحِ رواج و رسمِ عوام
ترے زمانے کا اک آئینہ ہے تیرا کلام
مورخین جو تاریخِ شعر جانتے ہیں　　دکن کا شاعرِ اعظم تجھی کو مانتے ہیں
ترے اشارے پہ بستی وطن کی بستی تھی　　وہ بستی جس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی
وہ بستی جس کا جواں تھا مذاقِ تعمیری
ترقیات کا عالم دکھا دیا جس نے　　دکن کو مرکزِ صنعت بنا دیا جس نے
تری کہانی زباں پر ہے رودِ موسیٰ کی　　کہ تشنگی سا تری تیری نظر کا حاصل تھی
ترے سرور کا باعث تھا عشقِ بھاگ متی
فضائے حسن تھی رنگیں تیری الفت سے　　تری حیات عبارت تھی آدمیت سے

برجموہن دتاتریہ کیفی کے دو خط

مشتاق احمد خاں عادل ادیبی

کیفی صاحب کے یہ خط جناب عبدالصمد سرکار رضا گلی کے نام ہیں۔ سرکار صاحب ریاست میسور کے کہنہ مشق شاعر، بے مثال ادیب اور اچھے نقاد ہیں۔ برسوں آپ کو علامہ کیفی مرحوم سے تلمذ رہا ہے جس کا پتا سرکار کے نام علامہ کے خلوص سے بھرے ان خطوط سے چلتا ہے جو درج ذیل ہیں۔

خط نمبر ۱

۱۷ علی پور روڈ سول لائنز دہلی ۱۸ مارچ سنہ ۴۹ء

مہربانِ من سلمہ

کل آپ کا خط ملا اس پر تاریخ روانگی نہیں تھی چونکہ میں ان دنوں میں بہت مصروف ہوں اس لیے آج ہی جواب دے رہا ہوں۔ میری نسبت آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں، بوڑھا آدمی ہوں ۸۳ واں سال جا رہا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق اور میں یہاں اس غرض سے آئے تھے کہ انجمن ترقی اردو کا کام پھر یہاں جاری ہو، میں یہاں کا کام دیکھوں اور وہ پاکستان میں رہیں مگر صورتیں ایسی پیدا ہو گئیں کہ دلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ اب میں اگلے مہینے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کار خدمت کی کیا ضرورت تھی خوش اور سلامت رہیے۔ غزل مع اصلاح واپس ہے۔

دعاگو۔ برجموہن دتاتریہ کیفی

خط نمبر ۲

۱۷ علی پور روڈ سول لائنز دہلی ۳ مئی سنہ ۴۹ء

سرکار جیو... کل آپ کا خط ملا، دونوں غزلیں دیکھ کر واپس ہیں خوب ہیں۔ دواں میں بھی وہ خط کہیں دوبارہ گیا تھا اس دن میز صاف کی تو کاغذوں کے نیچے سے نکلا۔ ماہنامہ چندہ وغیرہ دیکھا جائے گا ابھی تکلیف نہ کیجیے۔ یہاں انجمن کی نئی تنظیم ہو رہی ہے۔ نظم کے مطالعہ کی نسبت جو کچھ آپ نے لکھا ہے درست ہے۔

آپ کا یہ فقرہ سمجھ میں نہ آیا "آپ کی اجازت ہو تو کراچی سے خط و کتابت کرتا ہوں ورنہ نہیں" اس کی تشریح کیجیے۔ یہ یاد رہے کہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب بہت ہی مصروف آدمی ہیں ابھی مشرقی بنگال سے واپس آئے ہیں۔ یہاں میں تو دعا کرتا ہوں کہ آپ مدتوں سلامت اور تن درست و شادماں رہیں۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے، یاد رکھیے کہ قدرت حفظ بخشتی ہے کسی سے چھینا نہیں کرتی وہ انسان کے اپنے اعمال ہیں جو اسے قدرت کے عطیے سے محروم کر دیتے ہیں۔ آپ کا بھی اس وقت آنا ہو یا میرا جنوب کو جانا ہو تو ملاقات ہو سکتی ہے ورنہ ضعف ملاقاتیں رہیں گی یہ بے شمار اضعف مل کر بھی ایک ملاقات کے برابر نہیں ہو سکتے یہاں علم حساب عاجز ہے۔

جلد ہی جواب اس لیے دے رہا ہوں کہ پھر کشاکش میں پڑ جاتا کیونکہ آج اس خط کے بعد ایک نیا مضمون شروع کیے دیتا ہوں جو پورا ایک ہفتہ لے گا۔ زیادہ شوق بچوں کو دعا

اخلاص کیش برجموہن دتاتریہ کیفی

کوکب قدر سجاد علی مرزا

عشق نامہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

ابو محمد سحر صاحب نے "پری خانہ" نام کی سند میں خود واجد علی شاہ کے خط مطبوعہ بیگمات اودھ کے خطوط مرتبہ شیخ انتظام اللہ شہابی صفحہ ۳۰ اور عشق نامہ کے اشعار کا حوالہ دیا ہے۔ عشق نامے سے اور بھی اشعار اسی انداز کے پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن کسی بھی شعر سے کتاب کا نام "پری خانہ" دور از قیاس اور عبارت کا نام پری خانہ قرین اعتبار ہوگا۔ رہا وہ مجموعہ اور وہ خط، تو مجموعہ اس قابل نہیں کہ اس کو کسی نزاعی مسئلہ میں بطور سند پیش کیا جائے تخفیف۔ تحریف۔ اضافہ و ردو بدل ایسی کوئی علت نہیں جس کی مثال اس مجموعے کے خطوں سے نہ پیش کی جا سکے اور انشاء اللہ مناسب وقت اور موقعہ پر اس بیان کے ہر لفظ کی تائید میں اسی مجموعے سے شہادتیں پیش کی جائیں گی۔ سحر صاحب کے اطمینان کے لیے فی الحال اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ بھوالہ تمکین سرمدی جس "جدید الخط" لیکن "نایاب" "فارسی روزنامچہ" کے لیے "پری خانہ" نام مستند سمجھا گیا ہے وہ بھی اسی ذخیرہ سے نکلا ہے جس سے کہ وہ خطوط کا مجموعہ جس کا خط سند ہے۔ اگر دونوں مخطوطے "جدید الخط" ہوں تو تعجب نہیں اور ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے ہوں جب بھی تعجب نہیں۔ ان دونوں مخطوطوں کی مشترک خوبی یہ ہے کہ پبلشر ایسی چیزوں کے عاشق ہوئے ہیں۔

ایک میں "تصویر بتاں" دوسرے میں "حسینوں کے خطوط" ایک کی سند میں دوسرے کو پیش کرتے چلے جائیے اور کیا مجال جو آپ کے قلم یا زبان سے کبھی کوئی ایک بات بھی گرفت میں آسکے۔ لیکن یہ سب اسی وقت تک جب تک کہ سارا کھیل تماشا ان دو کے درمیان ہے۔ ان دو سے آگے بڑھے اور غوطہ کھایا۔ قانون شہادت میں اسی لیے کچھ پابندیاں لازم قرار دے دی گئی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ کہ نازک اختلافات میں جب سند بہم پہنچائی جائے تو کہیں پر کچھ لکھا ہونا ہی کافی نہیں۔ ضروری ہے کہ وہ ذخیرہ بھی معتبر ہو اور وہ تحریر بھی قدیم ہو۔ یہاں نہ ذخیرہ کا علم ہے کہ وہ منشی صاحب کے پاس کیونکر آیا اور نہ تحریر کا علم کہ کس کی ہے اور کب اور کس طرح حاصل ہوئی پھر سند کس بات کی؟

مذکورۂ بالا اعتراضات اصل جواب سے پہلو تہی کرنے کے لیے نہیں کیے گئے بلکہ ایک ایسی واضح حقیقت کو یاد دلانے کے لیے کیے گئے جس کا علم رکھتے ہوئے بھی لوگ خیال نہیں کرتے خط کو کسی مجموعہ کا جزو ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ خود سحر صاحب کی خاطر سے ہم قبول کیے لیتے ہیں کہ نہایت معتبر ذخیرہ سے برآمد ہوا ہے اور ہر طرح لائق اعتبار ہے صرف اس کی عبارت کو پرکھنا ہے کہ واجد علی شاہ کی ہے یا کسی اور کی۔ اختصار کے پیش نظر اسی اقتباس کو لیجیے جس کا سحر صاحب نے حوالہ دیا ہے:۔

خط بنام نواب شیدا بیگم صاحبہ

"......... گر سے جانی سن اصلی کہانی اپنے پری خانہ میں اور حزن اختر میں اس کا ذکر عالم نواب نگار محل صاحبہؓ کا کچھ قصہ لکھا ہے۔ کچا چٹھا بھی سب اس میں آ گیا ہے۔"

مخاطب کرنے کا انداز اور الفاظ بظاہر واجد علی شاہ کے مستند بیانات اور انداز تحریر سے مماثلت اور درحقیقت منافرت رکھتے ہیں۔ یہ خط کتاب کے گیارہ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے اور اگر یہ خط واقعی واجد علی شاہ کا ہے تو طوالت میں اپنی مثال آپ ہے۔ نیز جس افراط سے دوسروں کے عشقیہ اشعار اس خط میں محل اور بے محل ملتے ہیں شاید ہی کسی اور خط سے پیش کیے جا سکیں۔ یہ خط "۱۲ / شوال ۱۲۷۶ھ" کا ہے۔ حزن اختر ی مطبع سلطانی سے ۹ / شعبان ۱۲۷۶ھ یعنی خط کی تاریخ سے سات ہفتے پہلے شائع ہوئی۔ اس کے تین ایڈیشن مطبع سلطانی (کلکتہ)، نولکشور (لکھنؤ) اور فروغ اردو (لاہور) ہمارے پیش نظر ہیں۔ اس میں نواب نگار محل کا نام ذکر "قصہ" "کچا چٹھا" کچھ بھی مجھے نظر نہیں آیا۔ حزن اختر نام اگرچہ خود مثنوی میں موجود ہے لیکن مثنوی کے کاتب عبدالرحمن احسن نے "حزن اختری" سے تاریخ طباعت نکالی ہے اور واجد علی شاہ اور وزیر السلطان بہادر کی تحریروں میں بھی یہی تاریخی نام ۱۲۷۶ھ ہوتا ہے۔ پری خانہ کی طرح حزن اختر نام بھی عوام کی زبان پر ہے۔ مثنوی کی طباعت کے بعد واجد علی شاہ کی اگر کسی دوسری تحریر سے حزن اختر نام پیش کیا جا سکے تو وہ نام مثنوی کے لیے سند ہوگا اور اس خط کے علاوہ اگر بادشاہ کی اور کسی تحریر سے عشق

۱؎ ۲۲ / نومبر ۱۹۶۵ء کے ہماری زبان میں خود سحر صاحب نے شہادت کی مزید

(نوٹ کالم ایک کا) تنقیح کو ضروری سمجھا حالانکہ ایسی ضرورت نہ تھی کیونکہ فاضل صاحب خود ناقل تھے کہ چشم دید گواہ تلق نے ایسا کہا اور ۲۰ / دسمبر ۱۹۶۵ء کے ہماری زبان میں اس احتیاط کو نظر انداز کر دیا حالانکہ خط کا چھپا ہونا اس کے مستند ہونے کی ضمانت نہیں۔

۲؎ ۔ مثنوی بحر مختلف (تصنیف ۱۲۷۵ھ، مطبوعہ ۱۲۷۶ھ) صفحہ ۳۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ ان بیگم کو طلاق دے چکے تھے اور کلیات شیوۂ فیض (تصنیف ۱۲۷۹-۱۲۷۳ھ، مطبوعہ ۱۲۷۶ھ) میں ان بیگم کے نام کسی غزل یا مثنوی کا ہونا دلالت کرتا ہے کہ ۱۲۷۵ھ سے قبل قطع تعلق ہو چکا تھا۔ شیدا بیگم ۱۲۷۶ھ میں ان پر رشک کرنا اس سبب سے بے محل ہے۔

نامہ کے لیے پری خانہ نام تلاش کیا جاسکے تو وہ نام عشق نامہ کے لیے سند ہوگا جس زمانے میں یہ نام بنا خط شیدا بیگم کو لکھا گیا اور جس محبت کا اظہار اس خط کے الفاظ سے ہوتا ہے اس کی امید نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ بادشاہ ان سے بیزار ہو چکے تھے[۱] اور یہ بھی تحقیق طلب ہے کہ شیدا بیگم اس زمانہ میں تھیں کہاں، لکھنؤ میں یا کلکتہ میں۔ میرے ناقص علم میں یہ خط اتنا ہی جعلی ہے جتنا کہ مثنوی خاقان سرور اور اگر اجازت ہو تو عشق نامہ کی کسی داستان کو لیکر کمترین بھی ایک دلچسپ خط وضع کرسکتا ہے جس میں واقعات کی ترتیب وہی ہوگی جو عشق نامہ کی داستان میں ہے۔ اشعار حسب ضرورت گھٹائے بڑھائے جاسکتے ہیں۔ لیکن الفاظ کہیں بادشاہ کے ہونگے اور کہیں میرے[۲]۔ کیا ایسی صورت میں آپ خاقان سرور نام عشق نامہ کے لیے مستند سمجھیں گے، اور کیا اس خط کے کسی مجموعہ میں چھپ جانے سے حقیقت بھی چھپ جائے گی؟

پروفیسر صاحب کے استدلال کے مطابق مثنوی عشق نامہ اگر اسیر نے نظم کی ہو تو بھی واجد علی شاہ ہی اس کے مصنف ٹھہریں گے اور اسیر کو اس کا مصنف کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اگر اس استدلال کو قبول کرلیا جائے تو مثنوی عشق نامہ تو واجد علی شاہ کی تصنیف قرار پائے گی اور خود واجد علی شاہ کی چار برس کی کمائی اور اردو کی طویل ترین مثنوی ثبات القلوب ملا محمد باقر مجلسی یا مولوی سید تصدق حسین صاحب کے حصے میں جائے گی، کیونکہ ملا باقر مجلسی کی عربی، فارسی کتاب بحار الانوار۔ حیات القلوب کو مولوی صاحب نے تصحیح و نکشیر (لکھنؤ) سے شائع کیا اور فارسی کے ضخیم نسخوں کو قدیم و اضافہ واجد علی شاہ نے اردو نظم کا جامہ پہنایا۔ میرے خیال میں جو زمانہ کا دستور ہے وہی مناسب ہے بجائے اس کے کہ واجد علی شاہ اپنے ترجموں بہیت حیدری، ارشاد خاقانی، ریاض القلوب وغیرہ وغیرہ کو ان کے اصلی مصنفوں کے حوالے کردیں لوگ اگر بضد ہیں کہ عشق نامہ کو اسیر کو دیدیا جائے تو دے دیجئے اور دو مثنوی گویوں کی صف میں عشق نامہ کا مصنف قرار پانے کے بعد بھی اسیر وہ امتیاز حاصل نہیں کرسکتے جو عشق نامہ سے دستبردار ہونے کے بعد بھی واجد علی شاہ اپنی صرف ایک مثنوی ثبات القلوب کی بنا پر حاصل کرچکے ہیں۔

اپنے محاکمہ اور مقدمہ میں اس حد تک ہم نے انھیں گواہوں کا جائزہ لیا تھا جو عشق نامہ منظوم کو خوبی کلام کی جہت سے اسیر کی تصنیف قرار دینے پر مصر ہیں۔ ہماری نظر میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نفس مضمون سے اختلاف رکھنے کے سبب فارسی نثر کے عشق نامہ کو بھی واجد علی شاہ کی تصنیف ماننے پر تیار نہیں، ان لوگوں کی ترجمانی اور استدلال کی خوبی کے لیے صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"فاضل مصنف (نثار احمد فاروقی) اور قابل قدر ایڈیٹر صاحب (محمد طفیل، مدیر نقوش) کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ واجد علی شاہ کے سلسلے میں جو آپ بیتی انھوں نے مرتب کی ہے اس کا دنیا میں سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ انگریزوں نے واجد علی شاہ کی اصل (مہر) پر قبضہ کرکے جو تحریریں اور انشا نے واجد علی شاہ کی طرف منسوب کردیے ہیں ان کا مقصد اس عالم بے عمل کے خلاف ایک محاذ قائم کرنا تھا۔"[۲]

یہ ایک گرما گرم بحث کا نچوڑ ہے اور لکھنے والے کی غیر جانبداری کے لیے اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ وہ واجد علی شاہ کو عالم بے عمل کہنے میں تکلف محسوس نہیں کرتا لیکن ساتھ ہی وہ اس کے ماننے پر بھی تیار نہیں کہ جو باتیں اُن سے منسوب ہیں ان میں کوئی صداقت بھی ہے۔ بے لوث عقیدت مندانہ بیان عقیدت آمیز تنقید اور تبصرہ کا متقاضی ہے۔ ہمارے لیے اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ جب واجد علی شاہ اپنی ننگ نامی اور رسوائی سے بے نیاز ہوکر اپنی روداد خود اپنے قلم سے یادگار چھوڑ گئے ہیں تو ان کی صاف گوئی کی مدح سرائی کریں یا ان کی ناعاقبت اندیشی کا رونا روئیں۔ اپنی بے بسی اور مجبوری کو ہم چاہے جس طرح کی تاویلوں سے ڈھانکیں اور بلاشبہ انگریزوں کی شرمناک حکمت عملی کو چاہے جس عنوان سے پیش کریں حقیقت اَن مِٹ ہے۔ جو کتابیں واجد علی شاہ سے منسوب ہیں وہ انھیں کی ہے اور ان میں سے بیشتر ہی کی فہرست میں موجود ہیں اور یہ کتاب بھی مطبع سلطانی کی چھپی ہوئی اور

---

۱ تاریخ غزا، صفحہ ۲۳، شیر ح فیض صفحہ ۲۷۲

۲ خطوں میں بادشاہ کا اسلوب اور اشعار پیش کرنے کا سلیقہ دیکھنا ہو تو ان کے مستند مجموعے تاریخ مذہب، تاریخ غزا اور تاریخ ممتاز سامنے رکھیے میرے بیان کی بھی حاجت نہیں رہے گی اور خط اور داستان کا موازنہ مقصود ہو تو تحسین سروری کا ترجمہ مطبوعہ کراچی صفحہ ۱۵۶ اور خط شہابی صفحہ ۴۲ تا صفحہ ۴۳ کو لفظ بلفظ دیکھتے جائیے کیا یقین میں آنے والی بات ہے کہ چند سال کے بعد واقعات اور اشعار کی ترتیب ۱۲۶۹ھ میں بھی وہی ہو جو ۱۲۲۵ھ میں تھی۔ اگر یقین آجائے تو مرتب کو داد دیجئے اور اگر یقین نہ آئے تو مجھ کو مبارکباد دیجئے۔ آخرالذکر دونوں کتابیں بآسانی دستیاب ہو سکتی ہیں۔

۱ مرزا ابوالفتح رجعت مرحوم ایڈیٹر وثیقہ دار (لکھنؤ) نیز نواب فدا حسین (لکھنؤ) جن کا مضمون لکھنؤ کے قومی آواز یا سرفراز میں چند سال قبل شائع ہوا تھا۔ فی الحال صحیح حوالہ درج کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

۲ ابوالحسن حسنی جعفری مدیر رسالہ پیام عمل لاہور اپنے اداریہ میں شمارہ مورخہ اکتوبر ۱۹۶۳ء۔

شاہی کتب خانے کی مہر شدہ معتبر کتب خانوں کی زینت ہے۔ جو تمام اس بحث میں نہیں ہیں اور جن سے واجد علی شاہ پر آنچ آتی ہے۔ لوگ ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔ عشق نامہ انھیں کتابوں میں ہے جن کی توثیق بحث سے ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت خود اتنی رنگین ہے کہ کسی مزید حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ اس کتاب کے روشن پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے جن لوگوں کو دوسرے جلوے دکھائی دیتے ہیں ان کی بصارت اور بصیرت قابلِ رحم ہے۔ وہ جلوے درحقیقت دوسرے جلوے نہیں ہوتے۔ ان کی اپنی گندی ذہنیت کا عکس ہوتا ہے لہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست، اس کتاب سے محض جنسی تصویروں کو اکٹھا کرنا۔ ان پر دعوتِ نظر دینا۔ ان سے محظوظ ہونا اور پھر انھیں کو سامنے رکھ کر واجد علی شاہ کو برا بھلا کہنا ایک ایسی انسانی کمزوری ہے جس کے بارے میں پہلے ہی کہا جا چکا ہے ؎

فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر

پروفیسر صاحب نے محل خانۂ شاہی کے تین ایڈیشنوں کا شمار کیا ہے اس میں دو ایڈیشن اور شامل کر لیجئے۔ اول جہاد پرشاد ورما کا جگنندن لال پریس شہر ناسنگرام میں ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا اور رضا لائبریری رامپور میں ہے دوسرا مجید نجات شین پریس بجنور کا جس پر کاتب سید علی عباس کے دستخط ۱۵ر جولائی ۱۹۲۷ء کے ہیں اور نیشنل لائبریری کلکتہ میں ہے۔ ایک ہی سال ۱۹۲۷ء میں دو ایڈیشنوں کا دو مختلف شہروں لکھنؤ اور بجنور سے شائع ہونا دلچسپ اور اکبر علی خاں صاحب کا کتاب کے چار مختلف ایڈیشنوں کے شمار کو مشکوک سمجھنا تعجب سے خالی نہیں لیکن اسی سلسلہ میں ایک دوسرا انکشاف اور بھی دلچسپ ہے تذکرہ خانۂ جاوید پر لالہ سری رام کے دستخط ۱۵ر مارچ ۱۹۱۷ء کے ہیں لیکن اس کی دوسری جلد کافی عرصہ بعد شائع ہوئی۔ اسی میں خنجر کے بیان میں لکھتے ہیں۔

"اب حال ہی میں حضرت واجد علی شاہ کی تالیف پری خانہ کا ترجمہ کر کے شائع کیا۔"

اگر یہ اضافہ ۱۹۱۴ء کے بعد کا ہے تو خیر اور اگر ۱۹۰۰ء سے پہلے کا ہے تو محل خانۂ شاہی کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۴ء سے بہت پہلے شائع ہو چکا تھا محل خانۂ شاہی کا ایک نہایت ناقص نسخہ میرے پیش نظر ہے۔ پروفیسر صاحب کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ ۱۹۱۳ء کا ایڈیشن ہو لیکن قطعی فیصلہ اسی وقت کیا جا سکے گا جب ان دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر کتابت اور سطر کی بھی مطابقت کر لی جائے

عشق نامہ کے جن قلمی نسخوں کا پروفیسر صاحب نے ذکر کیا ہے ان میں سے چند نسخے راقم الحروف کی نظر سے بھی گزرے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کا نسخہ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے زمانے سے کس مپرسی کے عالم میں پڑا تھا۔ نام کی جگہ بجائے عشق نامہ کے صرف مثنوی واجد علی شاہ لکھا تھا اور یہی آج بھی لکھا ہے۔ مخطوطہ کی نقل حاصل کرنے کے لیے جب صحیح نام بتایا گیا تو مخطوطہ کے نگراں صاحب کو بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور اب ان کی عنایت سے متعدد حضرات اس نسخے سے مستفید ہو چکے ہیں۔ یہ نسخہ صرف اسی حد تک ناقص نہیں ہے جتنا کہ پروفیسر صاحب نے بیان کیا۔ کچھ صفحے ایسے ہیں جن کے شمار میں غلطی ہوئی ہے اور کچھ ہیں ہی نہیں۔ پروفیسر صاحب کے بیان کردہ عشق نامہ منظوم کے قلمی نسخوں کے علاوہ دو قابل ذکر نسخے اور ہیں۔ ایک خود واجد علی شاہ کے قلم کا، ناقص، لیکن اچھی حالت میں۔ دوسرا بلکہ بسم اللہ سے "رخانۂ" مادۂ تاریخ تک مکمل مع حواشی لیکن خستہ کرم خوردہ۔ ان دونوں نسخوں کے پیش نظر ذمہ داری لی جا سکتی ہے کہ ثانی الذکر نسخہ کی طرح عشق نامہ منظوم کا کلام خود واجد علی شاہ کا ہے۔ برق، امیر یا کسی اور استاد نے اصلاح دی ہو تو ممکن ہے، لیکن اصلاح سے تصنیف کی ملکیت نہیں بدل جاتی ۱۲۱ویں داستان کے بعد پروفیسر صاحب کے بیان کے مطابق اگر ۱۲۷۰ھ تک بتدریج اضافہ ہوتا رہا تو مجھے اس کا علم نہیں اور یہ اضافہ اگر امیر نے کیا تو عشق نامہ کو ابتدا سے امیر کی تصنیف قرار دینے کے لیے یہ تعاون کافی نہیں۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج میں پروفیسر صاحب نے صفحہ ۱۰۳ اور دوسرے مقامات پر کچھ بیانات "عشق نامہ منظوم" کے حوالے سے بقید صفحات نقل کیے ہیں۔ ماخذوں کی فہرست میں صرف "عشق نامہ فارسی" کا نام درج ہے۔ مجھے تو عشق نامہ کا مطبوعہ نسخہ ناقص یا مکمل دستیاب ہی نہیں ہوا اور پروفیسر صاحب کے قابل فخر ذخیرے سے استفادے کا موقع میسر آیا نہ اس موضوع پر بالمشافہ گفتگو یا خط و کتابت کی سعادت نصیب ہوئی لیکن خود پروفیسر صاحب کے منتشر بیانات کو یکجا کرنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ کہ منظوم مطبوعہ نسخہ کا سال طباعت ۱۲۷۵ھ یا اس کے بعد کا ہونا چاہیے۔ ۱۲۶۰ھ سے ۱۲۶۸ھ تک ۱۲۷۳ھ اس کے بعد

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

تبصرے کے اجمالی بیان سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں ان کے پیش نظر عشق نامہ کے ابتدائی دو شعر بھی نقل کر دیے جاتے ہیں تاکہ کتر بیں سے سوئے ظن رکھنے والے یہ دیکھیں کہ "پری خانہ" بھی پروفیسر صاحب کے مستحق ہوا کیا ہے۔ دو شعر یہ ہیں ؎

کروں پہلے حمد خدائے کریم — خبیر و قدیر و غفور الرحیم
پس از حمد نعت محمد کروں — ثنا خوانیِ آلِ احمد کروں

لہ بہادر شاہ ظفر کے اس شعر سے ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا
کے مصداق ہیں۔ شاید ہی واجد علی شاہ سے بہتر کسی کی سوانح حیات پیش کی جا سکے۔ اور ان کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کے اجاگر کرنے میں بھی کسی اور تصنیف یا شہادت کو بھی زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں عشق نامہ کافی ہے اور اس کے یہ دو شعر ؎

خلاہر نہ ہو مجھ سے چین بر جبیں — فرشتہ نہیں ہیں فرشتہ نہیں
جدائی میں ہوتی ہیں باتیں خلاف — خدایا ترحم الٰہی معاف

جیسے واقعات فرداً میں آئے پیش کافی ہیں۔

سے اکبر علی خاں کا مراسلہ ہماری زبان یکم [illegible] صفحہ

سے نمبر اردو [illegible]

سہ ہماری زبان یکم نومبر ۹۵ء عشق نامہ کے بارے میں خان صاحب کا مشورہ کہ اعتراض خنجر پر ہونا چاہیے قابل قبول نہیں۔ وجہ عیب بے دلیل عیب ہے کوئی قاعدہ نہیں ہے [illegible] تحسین سروری خود اپنے بیان سے خنجر کے ترجمہ سے ناواقفیت کا اظہار کر چکے ہیں۔ ان کی وکالت میں خنجر کو پیش کرنا کہاں کی انصاف پسندی ہے۔

تقریبِ تہنیتِ اعجاز

۲۹ر جنوری ۹۶ء کو پروڈکٹیوٹی سنٹرل ہال اور ہاری بلڈنگ، سول لائنز، الہ آباد میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونی ورسٹی کو ان کی خود نوشت سوانح عمری 'میری دنیا' کی پہلی جلد پیش کرنے کے لیے ان کے شاگردوں اور دوستوں کی طرف سے جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اردو اور ہندی کے ممتاز ادیبوں اور عمائدین شہر نے شرکت کی۔

سب سے پہلے جلسے کے کنوینر جعفر رضا صاحب نے ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کی ادبی اہمیت اور شخصی عظمت بیان کرتے ہوئے جلسے کے انعقاد کی وجہ بیان کی اور اس کی صدارت کے لیے پروفیسر سید احتشام حسین کا نام تجویز کیا۔

مسندِ صدارت پر پروفیسر احتشام حسین کے بیٹھنے کے بعد الہ آباد کی ادبی انجمنوں، انجمن ترقی اردو، اردو ایسوسی ایشن الہ آباد یونی ورسٹی، پوسٹ گریجویٹ اسٹڈی سرکل، الہ آباد یونی ورسٹی، ادارہ ذکر، ادارہ رسالہ نشیمن، لوک بھارتی، نیلابھ پرکاش، پرگتی، اردو اسٹڈی سرکل، وچار کیندر نے ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کی خدمت میں گلدستے پیش کیے۔

ایک مختصر اور پُرمغز تقریر میں کتاب 'میری دنیا' کا سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین صاحب نے اس کتاب کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اعجاز صاحب ایک ادیب اور نقاد کی حیثیت سے ملک میں مشہور ہیں اور ان کی تصانیف علم و ادب کے مختلف حلقوں سے خراجِ عقیدت حاصل کر چکی ہیں لیکن 'میری دنیا' کی نوعیت مختلف ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے بہت سے شاگردوں کے حالات اور ان کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔ ان کے شاگردوں نے اسے اپنی کوششوں سے شائع کیا ہے اور میں ان کی طرف سے اس کی پہلی جلد استادِ محترم کی خدمت میں نذر کرتا ہوں۔

مقررین میں سب سے پہلے ڈاکٹر سید حسن صاحب سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، الہ آباد یونی ورسٹی نے ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب سے اپنے دوستانہ تعلقات اور ان کے خلوص و محبت کا ذکر کیا۔ ان کے بعد ہندی کے مشہور شاعر اور مصنف جناب سی۔ پی۔ ورما صدر ہندوستانی اکاڈمی نے اعجاز صاحب کے وسیع اخلاق اور علم دوستی کا ذکر کیا۔ ہندی اور انگریزی کے مشہور نقاد پروفیسر پرکاش چندر گپت نے کہا کہ تھرس ڈے کلب کے روحِ رواں کی حیثیت سے اعجاز صاحب نے ادبی مرکزیت حاصل کر لی ہے۔ ان کے دل میں اپنے دوستوں اور شاگردوں کے لیے بڑی جگہ ہے۔ ہندی میں تو اس طرح کے جلسے ہوتے رہتے ہیں لیکن اردو میں اس قسم کا جلسہ میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اس طرح کے جلسے دوسرے ممتاز ادیبوں کے لیے بھی ہوں۔

جناب اوپیندر ناتھ اشک نے ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کی شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ دوست رہ کر تو بہت سے لوگ خوش اخلاق اور ہمدرد رہتے ہیں لیکن آدمی کا صحیح کردار اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ مخالف کی حیثیت سے سامنے آئے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اسی کسوٹی پر آدمی کو پرکھتے ہیں اور اعجاز صاحب کے سلسلے میں اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایک زمانے میں جب ان میں آپس میں مخالفت ہو گئی تھی اس وقت بھی اعجاز صاحب نے اپنے بلند کردار کا مظاہرہ کیا کہ ان کو ان کی بزرگی کا قائل ہونا پڑا۔

جناب مسیح الزماں صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب ان کے استاد، شریکِ کار، اور صدر شعبہ رہے ہیں اگرچہ وہ ان سے عمر اور مرتبے میں بہت بڑے ہیں لیکن ۲۵، ۲۶ برس کے عرصے میں انھوں نے کبھی یہ محسوس ہونے نہیں دیا کہ وہ ایک ہمدرد دوست اور ساتھی کے علاوہ بھی کچھ اور ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اعجاز صاحب کے کردار کی بنیادی خصوصیت انسان دوستی اور دردمندی ہے۔ کسی کو مدد کی ضرورت ہو وہ جس حال میں بھی ہوں اس کی دستگیری کو پہنچتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے تمام شاگرد ان کو ایک سہارا سمجھتے ہیں۔ ایسا سہارا جو ان کے دل کو تقویت اور طبیعت کو حوصلہ اور امنگ بخشتا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ہندی کے مشہور صحافی اور مصنف سری کرشن داس نے کہا کہ اعجاز صاحب کا میرا برسوں کا گہرا رشتہ ہے، ایسا رشتہ جو باپ اور بیٹے کا رشتہ ہے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء کے پُرآشوب زمانے میں اعجاز صاحب نے عملی طور پر محبت اور اتحاد کا مظاہرہ کیا، وہ ایک چٹان کی طرح اپنی جگہ ڈٹے رہے ہیں۔ انھوں نے تقسیم کے زمانے میں کہا تھا کہ اس ملک میں ہمارے آبا و اجداد کی ہڈیاں گڑی ہوئی ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے آج تک انھوں نے ترقی پسند نظریات کو سامنے رکھا ہے۔ اعجاز صاحب ایک اونچے ادیب تو ہیں ہی لیکن اس سے بڑھ کر میں ان کی عزت اس لیے کرتا ہوں کہ وہ ایک بہت اونچے انسان ہیں۔

دیگر مقررین میں ڈاکٹر سید رفیق حسین، ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی، جناب زوار عباس، جناب فیاض حسین اور جیب رمیش دت ترپاٹھی نے اعجاز صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سراہا۔

ڈاکٹر زوار حسین زوار اور عثمان عارفی صاحبان نے نظموں کے ذریعے ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے آخر میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں نے اس وقت میرے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا انھیں سن کر مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ اس عمر میں بھی میرے حواس ابھی اتنے قائم ہیں کہ میں یہ سمجھ سکوں کہ جن خوبیوں کا آپ نے ذکر کیا وہ آپ کے تاثرات ہیں ورنہ مجھ میں وہ خصوصیات واقعی نہیں ہیں جنھیں آپ نے بیان کیا۔ میں

اپنی کمزوریوں سے واقف ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ کاش واقعی وہ خوبیاں مجھ میں ہوتیں جو آپ لوگوں نے مجھ سے منسوب کی ہیں۔ انھوں نے اپنے جملہ احباب اور شاگردوں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے تقریب میں شرکت کی خصوصاً پروفیسر سید احتشام حسین اور جعفر رضا صاحبان کا جن کی سعی سے ایسا شاندار جلسہ منعقد ہوا۔

انھوں نے بتایا کہ میری دنیا نہ ان کی مکمل سوانح عمری ہے اور نہ تنقیدی کتاب مگر یہ انھیں اس لیے عزیز ہے کہ اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے درمیان ان کی زندگی گزری ہے جن کے دکھ میں ان کا دکھ اور جن کی مسرتوں میں ان کی مسرت شامل رہی ہے۔ میری دنیا محدود ضرور ہے لیکن یہ چھوٹی سی دنیا ان کو بہت عزیز ہے اور اسی دنیا کے افراد کے بارے میں انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے ہیں اور اس میں پیش کیے ہیں۔ "میرے جن شاگردوں نے اس کتاب کی اشاعت اور اس جلسے کے انعقاد میں عملی حصہ لیا ہے ان کے جذبات کی میں قدر کرتا ہوں اور انھیں جذبات نے مجھے اس وقت ایک حد تک گلوگیر کر رکھا ہے، اس لیے میں کچھ اور نہیں کہوں گا۔"

جلسے کے آخر میں کنوینر جناب جعفر صاحب نے ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اس تقریب کے منعقد کیے جانے کی منظوری دے کر ہمارے نذرانۂ عقیدت و محبت کو قبولیت کا شرف عطا کیا اور جملہ حاضرین کی تشریف آوری پر ممنونیت کا اظہار کیا جنھوں نے جلسہ میں شرکت کر کے اسے کامیاب بنایا۔

(نامہ نگار)

اردو کو قانونی موقف دینے کیلئے سرکاری زبان بل میں دفعات شامل کیجائیں

انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام منعقدہ جلسہ عام میں قرارداد کی منظوری

حیدرآباد۔ ۲۶ جنوری۔ آندھرا پردیش میں تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کو قانونی موقف دیے جانے کا مطالبہ کرتے ہوئے آج شام اردو ہال حمایت نگر میں منعقدہ جلسۂ عام میں قرارداد منظور کی گئی جس میں تلگو سرکاری زبان بل کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ہر لحاظ سے یہ ایک صحیح اقدام ہے جس کو روبہ عمل لانے میں اب مزید دیر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ جلسہ اس بات کو ضروری سمجھتا ہے کہ اردو کے استعمال کے لیے بھی مجوزہ قانون ہی میں ضروری دفعات شامل کی جائیں اور اردو کے علاقائی موقف کو قانونی صورت دی جائے۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے زیر اہتمام یوم اردو کے سلسلہ میں منعقدہ جلسۂ عام کی صدارت نواب مہدی نواز جنگ سابق گورنر گجرات نے کی۔

جناب حبیب الرحمٰن معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے اردو کے علاقائی موقف کو قانونی شکل دینے پر زور دیا اور کہا کہ فروری میں اسمبلی سیشن میں ریاست کی سرکاری زبان تلگو کے بارے میں مسودہ قانون پیش کیا جانے والا ہے اس میں اردو کے بارے میں بھی ترمیم پیش کر کے منظور کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے بتایا کہ آندھرا پردیش میں بسنے والی ۸۰ فی صد سے زائد آبادی تلگو بولنے اور سمجھنے والی ہے اور اس طرح یہ تلگو دیس کہلاتا ہے۔ ہم کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں لیکن جہاں تلگو ریاست کی اکثریت کی زبان ہے وہاں اردو اقلیتی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم کسی چیز کی بھیک نہیں مانگتے بلکہ ہم اپنا حق چاہتے ہیں۔ آندھرا پردیش کے پہلے چیف منسٹر نے تلگو کے ساتھ اردو کو اس کا حق دینے اور علاقائی زبان قرار دینے کا اعلان کیا۔ اردو کو دیے گئے تحفظات کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ پنڈت ونشی دھرو دیالنکار نے ہندی پرچار سبھا کی جانب سے اردو کے علاقائی موقف کو قانونی شکل دینے اور سرکاری مسودہ قانون میں تلگو کے ساتھ اردو کو بھی شامل کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ آزادی اور لسانی بنیادوں پر ملک کی تقسیم کے بعد لسانی زبانوں بالخصوص علاقائی زبانوں کو ترقی دینے کا رجحان ختم ہو رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ حیدرآباد میں اردو سرکاری مدارس اور عوام کی زبان رہی ہے۔ مسٹر دیو ویا ایڈیٹر ملاپ نے کہا کہ اردو کے علاقائی زبان کے موقف کو عملی اور قانونی موقف دیا جانا چاہیے۔ ہم اردو والوں کا صرف یہی مطالبہ ہے کہ حکومت نے جو اعلانات کیے ہیں انھیں کو عملی صورت دی جائے۔ یوم اردو منانے کا مقصد کوئی جدوجہد کرنا نہیں ہے بلکہ یہ حکومت کے اعلانات کو عملی صورت دینے میں مددگار و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اردو بہت بڑی اقلیت کی مادری زبان ہے اس زبان کے بولنے والوں کو وہی سہولت حاصل ہونی چاہیے جو دوسری زبان بولنے والوں کو دی جا رہی ہے۔ انھوں نے اردو داں پبلک سے اپیل کی کہ اردو کے علاقائی موقف کو قانونی شکل دینے کے لیے متحد اور منظم طریقہ پر کام کریں۔ مسٹر مخدوم محی الدین ایم۔ ایل۔ سی نے کہا کہ اردو کے علاقائی موقف کو قانونی شکل دینے کا مطالبہ جائز منصفانہ اور حق بجانب ہے۔ ریاستی اسمبلی کے فروری سیشن میں تلگو کو سرکاری زبان بنانے کا جو مسودہ قانون پیش کیا جائے گا اب یہ سرکاری زبان بل سلکٹ کمیٹی میں زیر غور ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرکاری دفاتر و عدالتوں میں تمام کاروبار جہاں تلگو زبان میں ہونے چاہئیں وہاں اردو میں بھی نظم و نسق کی کارروائی رکھنی چاہیے اور دفاتر اور عدالت کے علاوہ اسمبلی کونسل اور پارلیمان کے بلس بھی اردو میں ہونے چاہئیں۔ مسٹر مخدوم نے کہا کہ چلتے بعض عناصر کو اردو کے تعلق سے غلط فہمی پیدا ہو گئی اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اردو کے علاقائی موقف کے پیچھے "اردو ریاست" کا قیام ہے۔ یہ بات بالکل غلط اور گمراہ کن ہے۔ ہم تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کو اس کا جائز مقام دلانا چاہتے ہیں۔ پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارۂ ادبیات اردو نے اردو کو اس کا اس کا جائز مقام دینے پر زور دیا اور کہا کہ حکومت اپنی وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے اردو کے علاقائی موقف کو قانونی شکل دے گی۔ راجہ جانکی پرشاد صدر اردو مجلس نے سرکاری زبان بل کا خیر مقدم کیا اور توقع ظاہر کی کہ ریاستی حکومت اردو کے تعلق سے اپنے اعلانات کو عملی جامہ پہنائے گی۔ مسٹر رحمت علی ڈپٹی میئر حیدرآباد نے حکومت آندھرا پردیش کی ستائش کی کہ اس نے ریاست میں اردو کو علاقائی زبان قرار دیا تھا۔ مولانا عبدالحفیظ ابو یوسف ایم۔ ایل۔ سی نے توقع ظاہر کی کہ حکومت اردو کو سرکاری زبان دوم کی حیثیت سے قانونی موقف دے گی۔ نواب مہدی نواز جنگ نے اردو کے

علاقائی موقف کو قانونی شکل دینے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی حفاظت ان تمام لوگوں کا فرض ہے جو نہرو جی اور گاندھی جی کے پرستار ہیں۔ اردو کا تحفظ اور اسے فروغ دینے کی کوششیں قومی قائدوں کی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ حکومت نے اب تک جو اعلانات و یقینات دیئے ہیں ان پر وہ پوری طرح عمل کرے گی۔

(نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو کاسٹی کا انتخابی جلسہ

انجمن ترقی اردو کے قیام کی ذمہ داری جناب شمیم فیضی صاحب کو سونپی گئی، ۲۵ر جنوری کی شب تک ممبر سازی کا کام کیا گیا اور ۲۶ر جنوری ۱۹۶۶ء کی شب میں ۸ بجے انتخابی جلسہ عام طلب کیا گیا۔

اس انتخابی جلسہ سے پہلے ایک غیر رسمی ادبی نشست ہوئی جس میں شعرا نے اپنا کلام پیش کیا، صدارت جناب پریم چند مشتاق صاحب نے کی اور جناب فیض انصاری صاحب نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ انتخابات سے پیشتر ایک تعزیتی تجویز کے ذریعہ آنجہانی وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور شعراء اردو حضرت تلوک چند محروم، حضرت قیصر پریمی روی اور محترمہ جہاں بانو صاحبہ نقوی کے انتقال پر اظہار غم کیا گیا، اور متعلقین کو صبر کی تلقین کی گئی۔ بعد ازاں کنوینر مقامی شاخ جناب شمیم فیضی صاحب نے رپورٹ پیش کی۔

بعد ازاں جناب فیض انصاری صاحب نے انجمن کی کارکردگی کے متعلق مختصر تقریر کی اس کے بعد مقامی شاخ کی مجلس منتظمہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ماسٹر ارجن لال نسیم صاحب،	صدر
جناب شمیم فیضی صاحب،	سکریٹری
جناب زماں انصاری،	جوائنٹ سکریٹری
جناب آفتاب احمد عزم صاحب،	ممبر
" خلیل انجم	" "
" رحم علی	" "
" ممتاز حیدری	" "
" شمیم احمد انصاری	" "
" مصاحب علی	" "

آخر میں منتخب صدر ارجن لعل نسیم صاحب نے یقین دلایا کہ ہم متحدہ طور پر اردو کے مفاد کے لیے کام کریں گے۔ مجلس منتظمہ نے ہنگامی طور پر فیصلہ کیا کہ مقامی شاخ کا الحاق مرکز سے کر لیا جائے، لہٰذا مرکز کو مبلغ دس روپیہ بذریعہ منی آرڈر، بابت الحاق فیس اور انجمن کے ارگن "ہماری زبان" کا سالانہ چندہ روانہ کیا گیا۔

(شمیم فیضی سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ کاسٹی)

اودنی میں یوم اردو

یوم ۷ ر فروری ۱۹۶۶ء کی شام کے ۶ بجے انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ اودنی کے زیر اہتمام "یوم اردو" بڑے شاندار پیمانے پر منایا گیا جس کی صدارت جناب عبدالکریم صاحب قابل نے کی نائب صدر انجمن عبدالرزاق صاحب نے مہمانوں کا استقبال کیا اور جلسے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اردو زبان پر شہید الہاشمی نے اپنی ولولہ انگیز نظم سنائی۔

اس کے بعد جناب عبدالکریم رومانی صدر شعبۂ اردو آرٹس کالج اودنی، لکشمن ریڈی لکچرر آرٹس کالج اودنی اور عبدالرؤف خاں صاحب مدرس ہائر سکنڈری سکول اودنی نے اپنی تقاریر کے دوران آج کے جلسے کی اہمیت پر کافی روشنی ڈالی۔ سری نیواس لاہوتی شریک معتمد انجمن ترقی اردو آندھرا نے اپنی بصیرت افروز تقریر میں قومی زبان اور علاقائی زبان کی اہمیت کو جتاتے ہوئے اردو کے مقام کے لیے جدوجہد کرنے کی اپیل کی۔ اس کے بعد جناب محمد اسمٰعیل صاحب صدر انجمن ہذا نے ایک قرارداد حاضرین کرام کے سامنے پیش کی جو تمام کی اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔ آخر میں رومانی صاحب نے شکریہ ادا کیا اور یہ کثیر التعداد جلسہ رات کے ۹ بجے قومی ترانے پر ختم ہوا۔

(سکریٹری)

شاخ اننت پور (آندھرا) کے زیر اہتمام یوم اردو

انجمن ترقی اردو (ہند)، اننت پور کے زیر اہتمام "یوم اردو" نہایت شاندار پیمانے پر ۷ر فروری ۱۹۶۶ء کو منایا گیا جس کی صدارت جناب سری نواس لاہوتی صاحب، شریک معتمد انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے فرمائی۔ ڈاکٹر رضی الدین احمد صاحب (صدر شعبۂ اردو ویس دی یونی ورسٹی، تروپتی) نے اپنی پر مغز تقریر میں اردو زبان کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور مشترکہ کلچر کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ ملتا ہے۔ اس زبان کو زندہ رکھنا گویا ہندوستان کے اس ملے جلے سرمایہ کو محفوظ رکھنا ہے۔

سری نواس لاہوتی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو والوں کو اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ محض حکومت پر تکیہ کیے رہنا کاہلی کی نشانی ہے، اردو والے اپنے اندر سے احساس کمتری کو دور کریں اور آئینی طور پر جدوجہد کے ساتھ ساتھ خود بھی اردو تعلیم کے ادارے قائم کریں اور ثابت کر دکھا دیں کہ حکومتوں کے سہارے کے بغیر بھی زندہ زبانیں یوں پنپتی ہیں۔

آخر میں صدر صاحب نے حسب ذیل قرارداد پیش کی جس کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ ایم۔ اے جبار صاحب نائب صدر انجمن

نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

قرارداد

انجمن ترقی اردو اننت پور کے اراکین اور ہمدردوں کا یہ جلسہ اس مسودہ قانون کا خیر مقدم کرتا ہے جو تلگو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے اسمبلی کی آئندہ میقات میں پیش کیا جانے والا ہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک صحیح اقدام ہے جس کے روبہ عمل لانے میں اب مزید دیر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ جلسہ اس بات کو ضروری سمجھتا ہے کہ اردو کے استعمال کے لیے بھی مجوزہ قانون میں ضروری دفعات شامل کی جائیں۔ انجمن ترقی اردو (آندھرا پردیش) نے اس تعلق سے جو نمائندگی ریاستی حکومت میں کی ہے اور اردو کو قانونی موقف دینے کے لیے مسودہ قانون میں جو ترمیمیں پیش کی ہیں ان کی بھی یہ جلسہ پرزور تائید کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ریاست میں اردو کے موقف کو قانونی طور پر تحفظ کر دیا جائے۔

(میراں نظامی سکریٹری)

انجمن تحقیقات اردو دہلی یونیورسٹی کا ایک جلسہ

دہلی یونیورسٹی کی انجمن تحقیقات اردو کا جلسہ جمعہ ۲۸ جنوری ۷۷ء کو ٹیوٹوریل بلڈنگ آڈیٹوریم میں تین بجے سہ پہر کو زیر صدارت جناب پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ منعقد ہوا۔

جلسہ میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب صدر شعبہ اردو نے میر امن دہلوی کی تصنیف "گنج خوبی کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔

جلسے کی ابتدا ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ریڈر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی تقریر سے ہوئی جس میں انھوں نے پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا خیر مقدم کرتے ہوئے انجمن تحقیقات اردو کے اغراض و مقاصد پیش کیے۔

اپنے مقالے میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے میر امن دہلوی کی تصنیف "گنج خوبی" کے اسلوب کی خصوصیات کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ گنج خوبی "اخلاق محسنی" کا ترجمہ ہونے کے باوجود نثر نگاری کی بعض ایسی خصوصیات سے مرصع ہے جس کی بنا پر اسے اردو کی نثری تصانیف کے سلسلے میں قابل ذکر حیثیت حاصل ہے۔ اپنے مقالے کی ابتدا میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے ان مغربی اثرات اور خصوصاً یورپ کے تین اہم انقلابوں کا تذکرہ کیا جن کی وجہ سے یورپ اور اس کے بعد ہندوستان میں صاف اور سیدھی نثر اور سائنسی نقطہ نظر کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کے باوجود اس کی حیثیت ایک تجربے کی سی ہے اور اس کے تاریخی مرتبہ کا تعین کرتے وقت اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ فورٹ ولیم کالج کا اسلوب نگارش اس دور کا نمائندہ اسلوب نہیں ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ گنج خوبی کئی اعتبار سے باغ و بہار سے مختلف درجہ کی تصنیف ہے اور عام محققین کا یہ خیال صحیح نہیں کہ وہ نایاب یا ادبی اور لسانی اعتبار سے ناقابل اعتنا ہے۔ اس سلسلے میں فاروقی صاحب نے گنج خوبی کے ہندوستان اور یورپ کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا بھی ذکر کیا۔

مقالے کے بعد پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے مقالے کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ گنج خوبی ابھی تک گمنامی میں پڑی ہوئی تھی اب اس مقالے کے ذریعہ سے تحقیق و تنقید سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے گنج خوبی کا مطالعہ فکر و نظر کا نیا ذخیرہ پیش کر سکے گا۔

آخر میں ڈاکٹر محمد حسن نے جناب صدر اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ (برائے صدر شعبہ)

صفحہ ۸ سے آگے

تک کون اس سلسلہ کو آگے بڑھاتا رہا، اس کا ثبوت اس شخص پر فرض ہے جو عشق نامہ کے افسانہ کو واجد علی شاہ یا اسیر کی تصنیف قرار دے، اصلاح کا نام عشق نامہ نہیں، افسانہ کا نام عشق نامہ نہیں، مثنوی کا نام عشق نامہ ہے! ہماری ذمہ داری صرف ۱۲۶۶ء کے عشق نامہ تک ہے اور انھیں دو نسخوں کے پیش نظر جو میرے مقصد کے لیے مطلق اور مذہب اور معتمد نسخوں سے زیادہ قابل قدر ہیں۔ ان دونوں نسخوں کی مزید کیفیت بیان نہ کرنے پہ مجھے معذور سمجھا جائے اور معاف کیا جائے ؎

ہے کوئی بات ایسی جو چھپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اتنا بھی لکھا گیا تو بدرجۂ مجبوری، قبل از وقت، مزاح المومنین میں شرکت کا شرف حاصل کرنے کے لیے۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند)، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوایا پبلشر تدبیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا۔